© rasailojaraid.com

انقلاب اور نئی زندگی کا تصور ۱۹۴۸ء کی عربی شاعری میں نمو پذیر ہونے لگا ہے۔ سلمٰی نے اس کتاب میں عربوں کے نظریہ تنقید وادب کا بہت ہی جامع مطالعہ کیا ہے اور مکمل وسعتِ علمی اور انفرادی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ ؎۱

متذکرہ بالا کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد باقر علوان نے سلمٰی کی تنقیدی خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے:

"ان کی کتاب کا پہلا حصہ ۱۹ویں صدی کے اوائل سے ۱۹۳۰ تک پوری عرب دنیا میں ہونے والی ثقافتی، شعری، عقلی اور علمی ارتقاء کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ سلمٰی کا تجزیاتی انداز ممتاز اور اہم شعراء اور شعری تجربات میں ان کے حصے اور بعد کی نسل پر ان کے اثرات پر بہت عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرے حصے میں انہیں شعری ہیئتی تجربات کے ساتھ رومانوی واپولو تحریک سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کا جائزہ لیا گیا ہے، جو کہ شعری ہیئت، تکنیک، اور موضوع میں تبدیلی کا ایک بنیادی اسال ہے۔ یہ حصہ نئی شاعری کے ارتقاء اور ابتداء کا خوبصورت اور بہتر تجزیہ ہے"۔ ؎۲

سلمٰی نے عربی شاعری کا ایک انتخاب (Anthology) اور مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے۔ اور ناولوں کا انگریزی ترجمہ کیا ؎۳

؎۱ Issa J. Boullata "Review On Trends And Movements In Modern Arabic Poetry". The Muslim World London.

؎۲ M. Bakir Alwan "Review On Trends And Movements" Middle East Journal (WASHINGTON) Winter 1980

؎۳ عربی شاعری کا انتخاب Modern Arab Poetry کے عنوان سے نیویارک ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ کہانیوں کا مجموعہ Litterature of Modern Arabia ہے۔ انہوں نے امیل حبیبی کے ایک ناول کا ترجمہ T. Gassick کے اشتراک سے The Secret Life (مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۲) کے نام سے کیا ہے۔ یوسف القاعد کے ایک ناول کا ترجمہ War In The Land بھی انہوں نے کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کا مجموعہ دیوان "العودة من النبع الحالم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔[1]

(۳) معاصر عرب نسائی ادبیات کے منظرنامے پر جو چند اہم شخصیتیں ابھر کر آئی ہیں ان میں فدوی طوقان، نازک الملائکہ، عزیزہ ہارون کے ساتھ سلمیٰ الخضراء الجیوسی بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کا نسائی شعری تجربے میں گراں قدر حصہ ہے۔ عرب میں آزادیِ نسواں کی تحریک سے متاثر ہونے والی ان خواتین شاعرات و ادیبات کے باغی گروہ سے یہ بھی متعلق ہیں۔ جنہوں نے روایتی سماجی نظام کے حصار کو توڑ کر مردانہ بالادستی والے معاشرے کو چیلنج دیا اور معاصر سماجی و سیاسی حالات سے باخبر ایک جدید اور پڑھی لکھی عورت کو معاشرے میں پیش کیا۔ عربی شاعری کے "معشوقاؤں" کی بغاوت اور مردانہ روایت سے انحراف نے عربی شعر و ادب میں ایک خوشگوار باب کا اضافہ کیا ہے اور اس طبقہ نسواں کے داخلی باغیانہ جذبات و احساسات سے شاعری کو روشناس کیا، جن کے وجود سے کائنات میں رنگ ہے معاصر خواتین شاعرات نے عربی ادب کی نئی تشکیل و ارتقاء میں مردوں کے دوش بدوش حصّہ لیا ہے۔ بلکہ بعض خواتین شاعرات کا مقام و حصّہ تو شاعروں و ادیبوں سے بھی بلند ہے سلمیٰ کے دیوان کے نصف حصّہ میں نسوانی رویے اور احساسات پر مبنی شعر ملتے ہیں۔ اور ان میں انقلابی معروضیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ مردانہ تفوق والے معاشرے کو عورتوں کی آزادی کے لئے ایک چیلنج قرار دیتی ہیں۔ اس لئے اس سماجی جبر کے خلاف اپنے شعروں میں آواز بلند کرتی ہیں، ان کے یہاں استحصال نسواں اور حقوق سے محرومی کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے اور وہ باغیانہ آزادانہ شعور کی لے میں یہ شعر کہتی ہیں جو تمام عورتوں کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اوحید فی عینلک نار تفرم	یثوی ویطلب، یستنید ویستجیب ویحکم
اما باعینا فان الوحید لنغز مبهم	وبحیرة النفس العمیقة موطنة[2]

---

[1] ان کا عربی دیوان بیروت سے شائع ہوا ہے۔ مگر مجھے نہ ملنے کی وجہ سے عربی مجلات میں شائع شدہ قصائد اور نظموں سے استفادہ کرنا پڑا ہے۔

[2] ناصر الدین الاسد، الشعر الحدیث فی فلسطین والاردن (القاہرہ [illegible]) ص [illegible]۔

© rasailojaraid.com

تنہائی، اداسی، وحشت اور خاموشی آج کی شاعری کا مقدر ہے۔ خصوصاً یہ چیزیں جب صنفِ نازک کے ساتھ ہوں تو ان کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کے احساسِ تنہائی (Lonesomeness) کی مثال یہ اشعار ہیں:

ولانت وحدك، انت وحدك، دون هاب البادة
والوحشة السمار تغرق ليلك السر الطويل
دنياك مظلمة وممتوم عليك ولوجها
فانسى طرح في افق على دنيا قريبه
قلبي!... غيومك قصة عمقة ولدمستبك
متلهفا ترجو الحياة... فلا بعثت اليوم حيا[1]

(۴) فدوی طوقان کے مقابلے میں سلمیٰ نے ہیئت اور مضمون دونوں ہی اعتبار سے زیادہ عمدہ سیاسی شعر کہے ہیں اور وہ سیاسی شعر کے مفہوم کو فدوی سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھتی ہیں، اس کے باوصف کہ اس میں کبھی کبھی خطابت کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کے چار قصیدے فداء، الصامدون، مرثیۃ الشہداء اور الثمار المحرقۃ خاص طور پر قومی و سیاسی مسائل سے متعلق ہیں۔

سلمیٰ کا عرب فدائین کے لئے لکھا ہوا قصیدہ "فداء"[2] ان کی جد و جہد اور قوم پرستی کی راہ میں اپنی جان کی قربانی سے متعلق ہے۔ شاعرہ نے اس میں براہِ راست "جاں بازوں" کے متعلق بحث نہیں کی ہے بلکہ قربانی کے اس جذبے اور روح کے بارے میں کی ہے جو ہر جانباز میں کارفرما ہے، اور یہی جذبہ انہیں سقوط و شکست کے بعد بھی تازہ دم اور بیدار کرتا ہے اور اس طرح جد و جہد کی یہ تحریک جاری رہتی ہے۔ اس قصیدے کے ان اشعار:

تباركت الارض، ارض الجدود، وارض السنابل والاقحوان
وارض الاغانى، وارض الزرايا، وارض السبالة والعنفوان

---

[1] ناصر الدين الاسد، الشعر الحديث فى فلسطين والاردن (القاهرہ۔ ۱۹۶۱) ص ۲۵۴۔
[2] دیکھئے، حسین نعمان، عز الدین اسماعیل: الادب والنصوص" (مصر، ۱۹۶۸) ص ۷۷،۷۶۔

© rasailojaraid.com

من عرض هذا الجحيم الوحشي --- تفجر الكفاح الحي

من الاصبر المعذب ردى ثراه عطاء السلام البحري

(" فـــداء ")

میں شاعرہ نے جانبازوں کی زبانی سرزمین وطن کی خیر و برکت بیان کرتے ہوئے اس پر مسلسل ظلم و جبر ہونے کی وجہ سے ان میں جو کیفیت شجاعت، استقامت، اور سخت جدوجہد کی پیدا ہوتی ہے اسے بیان کیا۔ اور اپنے پیشرو خود دار عربوں کی راہ پر چل کر آرزو، جدوجہد، قربانی اور سرخ آزادی کا راستہ اپنایا ہے۔ اس قصیدے کے بقیہ اشعار یوں ہیں۔

- وحين يجن الغروب
- وتغفو اعاصير روحي كما تتنفس الريح بعد الهبوب
- كما تخمد النار بعد الشبوب
- سيحتل تلك الذرا
- ويغزو القرى
- فدائي جديد
- اخ من رفاق الكفاح العنيد

اس میں شاعرہ جدوجہد کے طویل سفر کی داستان ایک فدائی کی زبانی یوں بیان کرتی ہیں کہ جس طرح مجھے اپنا خاتمہ معلوم ہے اسی طرح اس راستے کی انتہا کی بھی خبر ہے۔ جب میرا سفر ایک منزل تک پہونچکر ختم ہو جائے گا اور میرے دل میں بھڑکنے والا شعلہ جوالہ بجھ جائے گا تو میرے دوستوں میں سے جدوجہد کی راہ پر گامزن ایک فدائی میری جگہ لے گا۔ اور نئے سرے سے سفر کا آغاز کرے گا۔ اور اس طویل و پر مشقت راستے میں غایت مقصود کی طرف اپنے قدم بڑھاتے ہوئے موت کا بھی بہادری کے ساتھ استقبال کرتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لے گا۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور جانبازوں پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ عرب جانبازوں کا خون رائیگاں نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ روشنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کرن میں تبدیل ہو کر تاریک دل کو روشن کر رہا ہے، اور منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے قدم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ان کے خون سے آزادی کے بند راستے کھلیں گے۔ راستے کی مشکلات اور کاوشیں ختم ہوں گی۔ اس کیفیت کا اظہار ان شعروں میں ہے:

وعين يبيس هد يلة الرحيل

و يسدل جفن الظلام الكثيف

و يلتفت ثوب الفداء المصري على السامدين

اس قصیدے کے اجزاء معنوی اعتبار سے باہم مربوط ہیں۔ اس کے باوصف کہ "فداء" ایک بہادری کا موضوع ہے، جو گرمی اور شدتِ اظہار کا مقتضی ہے۔ مگر شاعرہ نے بہت ہی نرم انداز اور سنجیدہ انداز میں اسے بیان کیا ہے، کیونکہ حقیقی جانباز بنیادی طور پر سخت مزاج نہیں ہوتا۔ عمومی زندگی میں وہ نرم دل انسان ہوتا ہے۔[1]

اس قصیدے کے بارے میں ممتاز مبصر و ناقد محمد کاظم جواد کا خیال ہے کہ "اس میں پرسکون شعری نغمہ ہے جبکہ موضوع کے تقاضے کے مطابق اس میں گرمی، شدت، اور زور ہونا چاہیے تھا۔ اس میں گو کہ بسا اوقات شعری آواز کے فقدان کا احساس ہوتا ہے مگر کچھ ہی دیر تامل کے بعد قصیدے میں ایک عرب فدائی کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ سلمٰی کے اس قصیدے میں دیگر جدید قصائد کی طرح بعض ابیات میں نظم کی روح عام ہو گئی ہے اس طور پر وہ عام شعری فضا کے سیاق سے دور ہو گیا ہے جیسے شاعرہ کا یہ شعر ہے:

ذئاب تعربد في ارضنا وارسوا على الشاطئ الافرس

دونوں مصرعوں کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی معنوی اعتبار سے شاعرہ کا مقصد پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود قصیدہ خوب صورت منظر اور تصویر سے بھرپور ہے۔[2]

---

[1] حسین نصار و عز الدین اسماعیل، الادب والنصوص (مصر، ۱۹۷۸) ص ۷۵

[2] محمد کاظم جواد، "نقد القصائد" مجلۃ الادبیاء۔ بیروت (یونیو ۱۹۵۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح کے سیاسی نوع کا ایک اور قصیدہ "مدینۃ الطفل" ۱۹۶۰ء بھی ہے جس کے چند ابیات یوں ہیں:

هكذا ماتوا، ويمضى غير هم نحو المصير
قد رسمتموه رويا، ياجبل العطار
رمشة مهمومة تجتاح قلبى وتثير
رمعة الحزن بعينى ومفن الكبرياء

مندرجہ بالا ابیات جذباتی شدت اور بہاؤ لئے ہوئے ہیں۔ یہی کیفیت پورے دیوان پر محیط ہے۔ یہ "جبل العطار" کے المیے کی دردناک کہانی ہے۔ یہی وہ نسل ہے جو نہ اپنی خواہشات کو مکمل کرسکی اور نہ ہی آرزوں کو۔ اور بغیر کسی مستقبل کے اس دنیا سے گذر گئی۔ یہ جانبازوں کے لئے ایک پر زور مرثیہ ہے اور ان لوگوں کے لئے بھی جنہوں نے اپنے وطن کی خاطر اپنی جان تک دیدی۔ یہ صرف برسر پیکار نسل کا رزمیہ نہیں ہے بلکہ خوابوں کے زوال اور خوابیدہ چشمے سے تشنہ مراجعت کی ایک کہانی بھی ہے[۱] عرب دنیا دو طرح کے غموں سے دوچار ہے، موت اور ہزیمت، معرکہ کا میدان لاشوں سے بھرا پڑا ہے، جن کا ان شہیدوں سے ایک طرح کا رشتہ ہے یا قربت نصیب ہے وہ موت کی خاموشی میں بہادروں کی یادوں اور کامیابی کے جذبات و احساسات کو محسوس کرتا ہے۔ اور جلد ہی اسکی انتقام، انقلاب کی چیخ و پکار کے ساتھ غم زدہ آواز بھی مل جاتی ہے۔

اسی قصیدے کے یہ چند ابیات:

انا ادرى انهم ماتوا "ليحيا الوطن"
وطن القتلى، وحقل الدم هذا الوطن
انا ادرى انها "الحرية الحمراء" من الثمن

۱۔ تفصیل کے لئے، محی الدین صبحی: "الابطال المهزومون" الآداب بیروت (جلد نمبر ۱۹۷۰ء)

۲۔ محی الدین صبحی: "الابطال المهزومون" الآداب بیروت (جلد نمبر ۱۹۶۰ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الراكد، المنحوس بالاهات، هذا الشي

الذي لا ادري! انما الحزن باعماق الذات ليس يدري

انا ابكي كل حين فقدت ضوء الحياة

كل روح سالت من بين الشفاة!

یونان کے اسپارٹا کی اس روایت کی یاد دلاتے ہیں، جس میں وہاں کے باشندے دیوتاؤں کو اپنے بچوں کا خون بھینٹ چڑھاتے تھے جس سے قربانی کی ضرورت کا بھی احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی رنج والم بھی۔ انسان ان دونوں احساسات کا مجموعہ ہے یہی حقیقی قربانی ہے جس میں ایک انسان کو اس کا ادراک بھی ہے کہ قربانی کتنی عظیم اور اہمیت کی حامل ہے۔ اور ساتھ میں یہ احساس بھی کہ اس کی وجہ سے اس پر غمگینی اور حزینہ کیفیت بھی طاری ہوگی۔ مگر وہ بلند جذبات کے ساتھ مکمل رضامندی سے قربانی دیتا ہے اور ایک پوری نسل کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔ لے

سلمیٰ نے اس قصیدے میں یہ بات بھی کہی ہے کہ فلسطین میں ہر چیز معمول کے مطابق چل رہی تھی اور زندگی بہت پرسکون تھی مگر اچانک پناہ گزینی کے عذاب سے وہاں کے لوگ دوچار ہوئے تو شاعرہ بھی غمگین اور اُداس ہو کر یہ کہہ اٹھیں:

... و فریق یزرع الخیرات فیها، و فریق

یقطف الخیرات والازهار منها والاغانی

کان بعض منهم یحتال فی جنی دماها

... یعوی الانسان ... کانوا بشرا کالاخرین"

غسان کنفانی کے بقول یہ ابیات ان مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ جن کو جارج آرول (George orwell) نے اپنے ناول ۱۹۸۴ میں پیش کئے ہیں۔ یہ کہکر ہم یہ جانتے ہیں یہ کیسے ہوا؟ لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیوں کر ہوا؟ اس کو بہت ہی شدت اور جامعیت کے ساتھ "کانوا بشرا

(باقی صہ پر)

لے غسان کنفانی: "النبع الحالم - وحزن الهزیمة" "مجلة الآداب" بیروت (مدنیه ۱۹۶۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا الآخرین" بلکہ سلمیٰ نے پیش کیا ہے۔ کہ آخر صرف الیاس ہی کیوں یہ دکھ کیوں جھیلے۔ تکلیفیں کیوں برداشت کریں؟ [1]

شاعرہ کو اپنے خوبصورت دن یاد ہیں جب ہر چیز خیر و خوبی کے ساتھ گزرتی تھی۔ امن و سکون تھا۔ وہ بچپن کے یادگار دن تھے۔ جسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتیں۔

کم تواددنا سمارا ۔۔ وتسابقنا مع النجم القریب
وشدنا دنا فی الذری الخضراء فی المرج الخصیب
(یوم یدرک کم کان خصیب)

مگر اچانک فلسطینیوں کو شکست ہوئی اور بے وطن فلسطینی اپنے سرحد کو پار کرتے ہی "پناہ گزینوں" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ یہ حادثہ ان کے لئے روح فرسا تھا۔ اس احساس کی تصویر کشی سلمیٰ اس طرح کرتی ہے۔

وسالت البر والبحر علیهم ــــ وشحوب الفجر واللیل الحزین
فهدتنی نجمة مطفاة العین الیهم ــــ ولقایا الوسخ المحول من هیانهم
یوم خافوا الموت فی اوطانهم ــــ کی یعیشوا ۔۔۔ لاجئین

سلمیٰ نے فلسطینی پناہ گزینوں کے متعلق ایک انتہائی خوبصورت اور عمدہ نظم "بلا جذور" کے عنوان سے لکھی ہے، جو منفرد و منتشر خاندان کی المیاتی صورت حال کی ایک صحیح مثال ہے۔ یہ نظم اجنبیت و بیگانگی (Alienation) روح فرسا مصیبت اور پناہ گزینوں کی بڑھتی ہوئی خفگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ سلمیٰ نے اس میں بکھراؤ اور انتشار کے کرب کو پیش کیا ہے۔ اور اپنی عرب شناخت کے کھو جانے پر افسوس کا اظہار بھی۔ اس نظم کا مجموعی تاثر انتہائی گہرا ہے کیونکہ اس نے پناہ گزینوں کی بے چینی کی تصویر ان عربوں کی زبانی کھینچی ہے جو بہت ہی مسرور و مطمئن ہیں۔ سلمیٰ نے قومی ضمیر کو ایک زندہ آواز کی حیثیت دی ہے۔ اور مطلق اور پناہ گزینوں کی قرابت اور خونی رشتے پر وہ زور ڈال کر ان کے ضمیر کو للکار رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] غسان کنفانی: "النبع الحالم۔ وحزن البرتقال" مجلۃ الآداب، بیروت (جون ۱۹۶۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسط نمبر ۱

مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات

مختار احمد مکی، جمشید پور (بہار)

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی کتاب ـــــ Education In New India جوکہ پہلی بار ۱۹۵۶ء میں لندن سے شائع ہوئی، مولانا آزاد کے نام منسوب کیا ہے اس جملہ کے ساتھ کہ "وہ جنہوں نے ٹیگور اور گاندھی کے ساتھ ہندوستان کے لئے ایک قومی نظام کی تشکیل میں مدد دی" خواجہ غلام السیدین کا بھی یہی خیال تھا کہ مولانا فطرتاً سیاستداں نہیں تھے بلکہ ٹیگور گاندھی اور نہرو کی طرح ایک معلم تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صحیح معنوں میں ماہر تعلیم یا معلم تھے یا نہیں اختلاف کا موضوع رہا ہے مولانا عبدالماجد دریا بادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین انہیں اصطلاحی معنوں میں فلسفی یا ماہر تعلیم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے خیال میں مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ یا تعلیمی تصور کا تصور ہی سرے سے غلط ہے اور ان کے سرکاری عہدہ وزیر تعلیمات سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں جبکہ خواجہ غلام السیدین نے اپنے ایک مضمون میں معلم اور ماہر تعلیم کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے ایک تو وہ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں اس کا عملی تجربہ کرتے ہیں جنہیں تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرے وہ لوگ جنہیں قدرت کی جانب سے ایک خلاق فکر عطا کیا گیا ہے جو فلسفہ مذہب سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں جو جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی انگلیاں انسان کی زندگی اور اس کے نبض پر رہتی ہیں یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور وسعتوں سے روشناس کراتے ہیں اور تعلیم کو ان کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں ان کے ذہن میں

© rasailojaraid.com